اقبال کا پیغام

ڈاکٹر شجاع ناموس

یہ خصوصی لیکچر پروفیسر ڈاکٹر شجاع ناموس مرحوم و مغفور نے
عباسیہ لٹریری لیگ، بہاولپور کے زیر اہتمام،
ایک خصوصی اجلاس میں دیا تھا،
جو ۹/جنوری ۱۹۳۸ء بروز اتوار،
''اقبال ڈے'' کے طور پر منایا گیا تھا۔

بیشتر لوگ اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں اور ان کی غزلیں نظمیں پڑھ کر سر دُھنتے ہیں۔ شاعرِ مشرق کے نام سے ان کی شہرت ہے، ترجمانِ حقیقت اور حکیم الاُمّت کے القاب سے انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ مگر انھیں یہ معلوم نہیں کہ اقبال صرف شاعر نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک بڑا مجدّد اور اسلام کا سب سے بڑا زندہ مفکر ہے۔

میرا تعلق ڈاکٹر صاحب سے بہت عرصہ سے اور کئی طریقوں سے ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے ان کے وسیع علوم سے استفادہ کرنے کا موقع اکثر مرتبہ ہوا۔ جو کوئی نکتہ یا مقام کہیں اپنے استفادہ کے دوران میں میری سمجھ میں نہ آیا، وہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا اور انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ اس کو حل کر دیا، یہ استاد اور شاگرد کی حیثیت بہت عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ اس طویل عرصے میں مختلف شعبوں پر جن پر مجھے عبور ہے، اور ڈاکٹر صاحب سے متعلق ہیں۔ مثلاً فارسی، عربی، قدیم فزکس، نظری کیمیا، اسلامیات، مذہب، تاریخ سائنس، شاعری وغیرہ سب پر گفتگو رہی اور ہر بیان اور ہر شعبہ میں حضرت استاد کی معلومات اور علوم کو میں نے بہت وسیع اور ہمہ گیر پایا۔

کس قدر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہستی جس کو لوگ صرف شاعر سمجھتے ہیں، اتنا بڑا اسلام کا عالم ہو، کہ لوگ مذہبی رسائل اور کتب لکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے ارسال کرتے کہ ان میں کوئی بات خلاف شرعِ اسلام تو نہیں، تا کہ ہم اسے رسالے میں سے خارج کر دیں۔ حتیٰ کہ انجمن حمایت اسلام اس چشمۂ فیض کی ممنون ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باسفورس سے اس طرف شاید ہی کوئی عالم مل سکے، جسے اسلامیات پر اس قدر عبور حاصل ہو اور اسے اسلام کی الٰہیّات، سیاست، تاریخ غرضیکہ اسلام کے تمام شعبوں کے متعلق اس قدر وسیع معلومات حاصل ہوں۔ اس وُسعت نگاہ کو دیکھ کر جو فوق العادہ معلوم دیتی ہے، یہ خیال ہوتا ہے کہ انسانی قدرت سے باہر ہے۔ ہمارے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ اگر رسولؐ عربی کے بعد کسی پیغمبر کے ظہور کا امکان ہوتا تو میں کہتا کہ وہ اقبال ہے۔

اقبال بہت بڑا مفکر ہے، اس کا مضمون ایک عرصہ سے اسلام رہا ہے۔ اس کی گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالت کا نقشہ وہ کھینچتا ہے۔ لیکچر دیتا ہے۔ وعظ و نصیحت کرتا ہے اور آئندہ کے لیے عالم اسلامی کے لیے لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔

جب بعض لوگوں کو اس امر کا احساس ہوا کہ اقبال تو فلسفی ہے اور فلسفے میں اپنا مقصود شعر کے قالب

میں ڈھال کر بیان کرتا ہے تو انھوں نے اقبال کے شاعر ہونے سے ہی انکار کر دیا۔ بلکہ یہ پرچار شروع کر دیا کہ اقبال شاعر ہی نہیں وہ تو ایک فلسفی ہے۔اس کو شاعر کہنا غلطی ہے۔مگر یہ غلط ہے۔اقبال کی شاعری میں شعر اور تغزل کے تمام عناصر نہایت دلپذیر صورت میں موجود ہیں۔شعر مٹی سے بنا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ روح کے قالب میں ڈھالا ہوا، آتش اور رنگ و بو کا بنا ہوا آنکھوں سے قلب میں اتر جاتا ہے اور اپنی جگہ ہمیشہ کے لیے پیدا کر لیتا ہے۔اسی کا نام شعر ہے۔

اقبال کا مقابلہ یا موازنہ کسی زندہ یا گذشتہ شاعر سے کرنا غلطی ہے۔اقبال ایک صنف ہے اپنی ذات میں، وہ میدان شعر میں تنہا ایک بلند و بالا مقام پر متمکّن ہے۔اس کا موضوع مختلف ہے، اس لیے مقابلہ بیکار۔ اس کا کلام ایک پیغام ہے تمام عالم اسلامی کے لیے، اس پیغام کو شعر کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اقبال کے بلند خیالات کی حامل نظم ہی ہو سکتی تھی۔نثر اس رفعت اور پرواز سے عاری ہے۔یہی سبب ہے کہ اقبال نے اردو چھوڑ کر فارسی اختیار کر لی تا کہ تمام عالم اسلامی اس پیغام سے متمتع ہو سکے، اس کی اہمیت کو سمجھے اور اس پر عمل پیرا ہو۔حقیقتاً اقبال کی منظومات نے تمام اسلامی دنیا پر بہت بڑا اثر ڈالا اور اب تک یہ اثر جاری ہے اور قومیں اپنے آپ کو فکر اقبال کے سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ یہ ہندوستان کے لیے قابل فخر بات ہے کہ اس کے ایک سپوت نے اپنے کلام معجز بیان سے دنیا کے ایک وسیع حصے کی ذہنیت اور ان کے پروگرام کی منطق کو بدل دیا۔ گویا ان کی دنیا نئی کر دی۔(گویا انہیں ایک نئی دنیا سے آشنا کر دیا)

ایک شخص کے پاس بے بہا دولت ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ بنی نوع انسان اس مال فراواں سے فیض یاب ہو۔وہ تمام ملک میں سرائے رباط بنا دیتا ہے۔گویا اپنے مال و زر کے جائز مصرف کا اس نے یہ طریقہ نکالا۔اسی طرح اقبال کے پاس فکر، تدبر، فلسفہ، علم اور تنظیم کا ایک فراواں دریا بہتا ہے۔جب لوگوں کو فیضیاب کرنے کی سبیل پیدا کی گئی تو اس نے شعر کا قالب اختیار کر لیا۔اقبال کے لیے شعر ذریعہ ہے اپنا پیغام نشر کرنے کا۔ سچ پوچھو تو شعر بہت عمدہ ذریعہ ہے۔ چونکہ ہر خاص و عام اسے پڑھتا ہے، سمجھ سکتا ہے۔ یا بعض دفعہ نہ بھی سمجھے تو پڑھ کر حتّٰی کہ سن کر بھی محظوظ ہوتا ہے اور اسے بار بار دہراتا ہے۔اگر یہی پیغام نثر میں لکھا جاتا تو شاید اس قلیل عرصہ میں اسے قبول عام حاصل نہ ہوتا۔

اقبال کے مطابق شاعر وہ نہیں جو سفر اور حضر میں سامعین کو چند کلمات سنا کر خوش کر سکے۔ یا مشاعرے میں جا کر اپنی منظومات خوش الحانی سے پڑھ کر داد سمیٹے جس کی داد میں شعر کی خوبی سے زیادہ راگ کی خوبی شامل ہو، وہ شعر کی داد نہیں راگ کی داد ہے۔ اقبال اس کو بھی شاعر نہیں سمجھتا جو غزل گو ہو یا موزوں کلام کہنے پر قدرت رکھتا ہو۔اس کے خیال میں شاعر قوم کی آنکھ ہے۔

قوم گویا جسم ہے ، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظم حکومت ، چہرۂ زیبائے قوم

شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ[۱]

تو گویا جتنی بیماریاں قوم میں ہوتی ہیں ان کا اظہار شاعر کرتا ہے۔عیوب کی طرف توجہ دلاتا ہے اور پھر ان کو درست کرنے کا راستہ بتاتا ہے۔

پھر شاعر کے طرزِ بیان کے متعلق بحث کی ہے کہ اس کی زبان سے سنی ہوئی ہر بات دل میں اتر جاتی ہے۔اس کا طرز بیان پر جوش اور عیوب سے پاک ہوتا ہے۔

سینۂ شاعر تجلی زار حُسن
خیزد از سینائے اُو اَنوارِ حُسن
از نگاہش خُوب گردد خُوب تَر
فطرت از افسونِ اُو محبوب تَر
فکر اُو با ماہ و انجم ہم نشین
زِشت را نا آشنا خُوب آفرین
خضر و در ظلماتِ اُو آبِ حیات
زندہ تر از آب چشمش کائنات[۲]

گویا شاعر بہت بلند پرواز انسان ہے۔جو چاند اور ستاروں سے باتیں کرتا ہے۔اس کا فکر بہت بلند ہوتا ہے اور اس کے وعظ و نصیحت سے قومیں ابدی زندگی حاصل کرتی ہیں۔مگر بعض قوموں کے شاعر ایسے بھی ہیں۔جو انہیں غلط راستہ دکھاتے ہیں۔انہیں مستی اور فراموشی کی لوریاں دے دے کر سلا دیتے ہیں اور اس طرح سے یہ قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔ان شاعروں سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے۔

وائے قومے کز اجل گیرد برات
شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش
در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

نغمہ ہائش از دلت دُ زد و ثبات
مرگ را از سحر او دانی حیات
دریم اندیشہ اندازد تُرا
از عمل بیگانہ می سازد تُرا

خواب را خوشتر ز بیداری شمرد
آتشِ ما از نفسہایش فسرد

از خُم و مینا و جامش الحذر
از مئے آئینہ فامش الحذر[۳]

اقبال نے شاعری کا مقصود یہی جانا اور سمجھا ہے کہ وہ قوم کو جگا دے۔ اسے عمل اور زندگی کا راستہ دکھائے اور اسے آزادی کی طرف لے جائے۔

چونکہ لوگ اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں یا جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس لیے میں اس موضوع پر قطعاً بحث نہیں کروں گا اور اس کو بالکل نظر انداز کر دوں گا۔ اس موضوع کو کسی اور فرصت کے لیے ملتوی کر دیا جائے جس کا عنوان یہی ہو۔ فی الحال تو ہمیں اقبال کے پیغامبر ہونے کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ اقبال بلاشبہ مفکر ہے اور پیغام اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ مگر اس فکر اور طرزِ فکر پر بحث اس کے طرزِ عمل اور نتائج کو قلمبند کرنا یہ مضمون بذاتِ خود ایک طویل موضوع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے اس قلیل فرصت میں ہم صرف پیغام ہی کو لیں گے، کیوں کس طرح اور کیا ہوگا یا اس کے اثرات، ان کا فلسفہ اور حُسن و قبحِ کا مسئلہ بھی پیش نظر نہیں رکھیں گے۔ اس سے بھی بحث کے طول کھینچنے کا امکان ہے۔ ہم صرف اتنا دیکھیں گے کہ اقبال نے کون سا پیغام دنیا کو دیا۔ چند الفاظ میں یہ پیش کریں گے کہ یہ اقبالی پیغام دنیا کے نام کیا کہتا ہے۔ اس مختصر مقالے کا مدعا کسی طرح یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اقبال کے تمام فلسفے کو یا تمام پیغام کو بیان کیا جائے۔ یہ اس محدود میدان میں ناممکن ہے۔ سرِ دست غرض تعارف ہے۔ اسی لیے اشعار جو یہاں درج ہیں سلسلہ وار نہیں تسلسل کو پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ مضمون کو کہیں کہیں سے انتخاب کر لیا گیا ہے۔ باقی اصل میں سے قاری کو خود پڑھنا چاہیے۔ اس مقالے میں جو نثر موجود ہے وہ بھی حضرت علامہ کی نظموں کو گویا نثر میں لکھ دیا ہے۔ خیالات بلکہ فی الواقع الفاظ بھی انہیں کے ہیں۔ میں نے اپنی طرف سے کچھ اضافہ نہیں کیا۔ نہ ہی اپنی رائے دی ہے یا بحث کی ہے حقیقتاً یہاں پر اس بات کا موقع بھی نہ تھا۔

عملی زندگی بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ اقبال نے یورپ میں بسر کیا۔ اس قیام کا اثر طبیعت پر نمایاں ہوا۔ اس سے پہلے طبیعت پر اردو غالب تھی اور ہندوستان کو ہندوستانیوں کا مشترکہ وطن بنانے کی فکر۔ اس کے بعد فارسی مزاج میں داخل ہوگئی اور رجحان اسلام کی اخوت کی طرف بڑھا اور پھر اسی کی ترقی کسی نہ کسی رنگ میں پیش نظر رہی۔ گویا اقبال اس کے بعد سے اسلامی شاعر بن گیا اور ہوتے ہوتے اس نے تمام عالم اسلامی کا ملّی شاعر ہونے کی حیثیت اختیار کر لی۔

یہ بھی ایک بڑا طویل مسئلہ ہے کہ اقبال کے پیغام کا تجزیہ کیا جائے کہ اس پیغام کا مقصود کیا ہے۔ اسلام کس طرح سے نئے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔ اس میں نئی تنظیم کے آثار نمایاں ہیں۔ اسے کس راستہ پر چلنا چاہیے تاکہ ترقی صحیح روش پر ہو۔ اسلام کا مستقبل کیا ہے؟ وہ تمام مشرق پر چھا جائے گا؟ گویا مشرق اسلام

کے لیے ہی بنا ہے اور کوئی دوسرا مذہب اس سرزمین کے لیے مفید اور کار آمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ مغرب کی تہذیب ایک نہایت خوفناک دور سے گزر رہی ہے۔ آپس میں ہی مغربی اقوام کا تصادم ہوگا۔ یہ تہذیب اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کر لے گی۔ اس کی ایجادات اس کے اپنے لیے مہلک ثابت ہوں گی اور دنیا ایک نئی شکل اختیار کر لے گی۔ اس کے بعد اسلام ہی ایک مذہب ہے جو اجزائے پریشان کو یکجا کر کے ایک نئی تہذیب کی عمارت تعمیر کر سکتا ہے۔ اسلام میں تمام صلاحیتیں موجود ہیں وہ قدیم اور جدید پر حاوی ہے۔ اس کی تاریخ نہایت شاندار اس کی گزشتہ دور کی مثالیں ہمت افزا نہایت عالی وقار اور شاندار ہیں۔ گویا وہ ان تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ جو مستقبل کے عملی مذہب میں ہونی چاہئیں۔ اس طرح سے اسلام تمام عالم پر چھا جائے گا اور تمام دنیا چین اور سکون کی زندگی بسر کر سکے گی۔ چونکہ جب مذہب وملت، خیالات ایک ہو گئے تو پھر تصادم جنگ اور مخالفت کا موقع نہیں رہتا۔ تمام اقوام عالم کو مشورہ بھی یہی ہے۔ کہ وہ اسلام کی طرف رجوع کریں اور اس کے محاسن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس تجزیہ میں پڑنے کی ہمارے پاس اس وقت فرصت نہیں ہے۔ التوا لازم ہے۔

اس وقت آپ کے سامنے اقبالی پیغام کے چند موتی پیش کئے جاتے ہیں۔ میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہی اس خزانے میں سب سے بیش بہا ہیں۔ یا اس گلستان کے سب سے پُر بہار پھول ہیں۔ چونکہ وقت کی قِلّت نے تمام میدان کی تلاش کا موقعہ نہیں دیا۔

۱۹۰۵ء سے پہلے کے دور کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جب کہ اقبال ہندوستان پرست تھا اور اس ملک میں ایک قومیّت پیدا کرنے کا پرچارک تھا۔ ''ترانہ ہندی'' تو سب کو یاد ہے اس کا ایک شعر ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا[۴]

ہمارا دیس گویا ہندوستان اور ہم ہندی ہیں۔ معاملہ صاف ہو گیا۔ نیا شوالہ اس معاملے کو اور بھی واضح کر دیتا ہے پہلا شعر ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے[۵]

یہ تو گویا مشورے کا آخری حصہ ہے۔ اس انجام تک پہنچنے کے لیے اقبال کے دل نے مختلف منازل کے تمام مدارج طے کئے۔ یہ دیکھا کہ ہندوستان بہت سی اقوام اور زبانوں کا ملک ہے۔ اس میں بہت سے فرقے بستے ہیں۔ جو آپس میں برسرِ پیکار اگر نہ ہوں تو مناسبت بھی نہیں رکھتے۔ پھر یہ دیکھا کہ وطن کی بہتری صرف اس بات میں ہے۔ کہ ان تفرقوں کو مٹا دیا جائے۔ اس اختلاف کی شورش کو کم کر دیا جائے اور تمام ہندوستان کے تمام فرزند اپنے تن من دھن سے وطن کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ گویا آپس میں پریت کا رشتہ جوڑیں تو وطن کو آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ گویا وطن کی آزادی کو اپنا سب سے ضروری فرض سمجھیں اور باقی تمام باتوں کو اس کے زیرِ اثر تصور کریں۔ ہندوستان کے مرثیے اور اس کے مردہ دل ہونے کے حالات اقبال نے کئی جگہ پر لکھے ہیں۔ محبت اور یگانگت پیدا کرنے کی تلقین کی ہے اور آخر میں یہ کہا ہے کہ آزادی حاصل کرو۔

اس کا یہی طریقہ ہے کہ قدیم روش کو بدل ڈالو۔ ہندو اپنے مذہبی رنگ کو بدل دیں۔ دیگر مذاہب سے محبت کرنے کا سبق سیکھیں۔ مسلمان اور دیگر مذاہب اس نفرت اور بے توجہی کو چھوڑ دیں اور اپنے خیالات کو بدل لیں۔ گویا تمام وطن میں ایک نئی تنظیم کی تلقین کی ہے۔ یہی نئی تنظیم ہندوستان کو آزاد کرا سکتی ہے۔

اب دیکھیے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے راستہ یہ بتاتے ہیں کہ تمام انسانوں کے دلوں میں بلا قید مذہب و ملّت ہمدردی اور محبت ہو۔ عنوان ہے ''آفتابِ صبح''

ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشم باطن جس سے کُھل جائے وہ جلوا چاہیے
شوقِ آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے
زندگی بھر قید زنجیرِ تعلّق میں رہے
زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے
آرزو ہے کچھ اِسی چشم تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیازِ ملّت و آئیں سے دل آزاد ہو[٦]

یہ فلسفہ ہے آزادی کے حصول کا کہ جب افراد آپس میں محبت اور اُخوّت سے وابستہ ہو جاتے ہیں یعنی کوئی ایک ایسا تعلّق جسے ابن خلدون عصبیت کہتا ہے تو انہیں آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اب اس نظری مسئلہ کو عملی جامہ پہنانا ہے اور ہمارا مقصود ہندوستان ہے۔ تو ہندوستان کو پیش نظر کر کے لکھا، عنوان ہے۔ ''تصویر درد''

رلاتا ہے ترا نظّارا اے ہندوستان مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا — لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اِس باغ میں گلچین — تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے — عنا دل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری، یہ ایسی چیز ہے جس کو — وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر نادان مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کُہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک ، لذّتِ فریاد پیدا کر — زمین پر تو ہو ، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو! — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں[٧]

گویا ہندوستان تو آپس کے جھگڑوں اور مخالفتوں کی رزم گاہ ہے۔ غیر ملکی زور والا جو اس کے جی میں آئے کرتا رہے۔ اقبال کی صدا وطن کے لیے بہت ضروری ہے اور اہل وطن کو اسے کو سننا اور سمجھنا چاہیے۔ ہندوستان پر ایک کٹھن مصیبت آنے والی ہے۔ اس لیے اہل ہند کو چاہیے کہ سب یکجا ہو جائیں اور حصولِ

آزادی کے لیے آواز بلند کریں اور کوشش کریں۔ اگر وہ اس نصیحت پر عمل پیرا نہ ہوں گے تو مٹ جائیں گے اور ایسے میٹنگے کہ ان کی ''داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں''

اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلی بات جو ہر ایک کے ذہن میں آتی ہے۔ وہ اتفاق ہے۔ جہاں اتفاق نہ ہو وہاں کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے اقبال نے اب اس بات کا پرچار شروع کیا۔ کہ پرانی روش کو بدل ڈالو اور ہندو مسلم کو چاہیے کہ آپس میں اتحاد و یگانگت پیدا کریں۔ عنوان ہے ''نیا شوالہ''

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا ، تو نے بتوں سے سیکھا
مسلم کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا ، چھوڑے تیرے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اِک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی ، شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے[۸]

مطلب صاف ہے اور پریت کا سبق دیا گیا ہے۔

آخر اقبال نے یہ دیکھا کہ اس بدقسمت دیس میں پریت کے سبق کا پرچار بے سُود ہے۔ یہاں کا مسئلہ دھیان گیان اور واعظ سے حل نہیں ہوگا۔ بلکہ ڈنڈے سے اور ڈنڈا بھی وہ جو زبردست کا ہو۔ آخر مجبوراً دو بیڑیوں میں قدم رکھنے کے بجائے ایک کو ترک کر دیا۔ جب دیکھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے دو ساز ہم آہنگ نہیں ہوتے تو ایک ہی ساز کو اپنا بنا لیا اور پھر بڑے مزے لے لے کر اس کو بجایا یعنی اسلامی ملّی شاعری کو شروع کیا، ایک بحث غلامی اور آزادی کے موضوع پر کی ہے یعنی ایک نظریہ قائم کیا ہے۔ کہ ان دونوں حالتوں میں قوم پر

کیا اثر پڑتا ہے اور افراد کی قوتیں کس مصرف میں آتی ہیں۔ انسانی جذبات اور کیفیات پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ عنوان ''بندگی نامہ'' رکھا ہے۔

از غلامی دل بمیرد از بدن — از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی بزم ملّت فرد فرد — ایں و آں با ایں و آں اندر نبرد
آن یکے اندر سجود ایں در قیام — کارو بارش چوں صلاۃِ بے امام
آبروے زندگی در باختہ — چوں خراں با کاہ و جو در ساختہ
شورہ بوم از نیش کژ دم خار خاز — مور او اژ درگز و عقرب شکار
در چنین دشتِ بلاصد روز گار — خوشتر از محکومیٔ یک دم شمار
مرگ ہا اندر فنونِ بندگی — من چہ گویم از فسونِ بندگی
نغمہٗ او خالی از نارِ حیات — ہمچو سیل اُفتد بہ دیوارِ حیات
الحذر ایں نغمہٗ موت است و بس — نیستی در کسوتِ صوت است و بس
نغمہ باید تند رو مانندِ سیل — تا برد از دل غماں را خیل خیل
نغمہ گر معنی ندارد مُردہ ایست — سوز او از آتشِ افسردہ ایست
ہمچناں دیدم فنِ صورت گری — نے براہیمی درو نے آذری
می چکد از خامہ ہا مضمون موت — ہر کجا افسانہ و افسونِ موت
بے یقین را لذتِ تحقیق نیست — بے یقین را قوتِ تخلیق نیست
از خودی دور است و رنجور است بس — رہبر او ذوقِ جمہور است و بس
فکر او نا دار و بے ذوق ستیز — بانگِ اسرافیل او بے رستخیز
آں ہنر مندے کہ بر فطرت فزود — راز خود را بر نگاہِ ما کشوُد
آفریند کائناتِ دیگرے — قلب را بخشد حیاتِ دیگرے
در غلامی تن ز جان گردد تہی — از تنِ بے جاں چہ اُمیدِ بہی
تاز گیہا و ہم و شک افزایدش — کُہنہ و فرسُودَہ خوش می آیدش
در غلامی عشق و مذہب را فراق — انگبینِ زندگانی بد مذاق
دین و دانش را غلام ارزاں دہد — تابدن را زندہ دارد جان دہد
گرچہ برلب ہائے او نام خداست — قبلہٗ اُو طاقتِ فرمانرواست
ہر کہ بے حق زیست جز مُردار نیست — گرچہ کس در ماتمِ اُو زار نیست
زندگی بار گراں بر دوشِ اُو — مرگِ اُو پروردہٗ آغوشِ اُو
تن ستبر از مستیٔ مہر ملوک — جان پاک از لاغری مانندِ دوک
یک زمان بارفتگاں صحبت گزیں — صنعتِ آزاد مرداں ہم بہ بیں

همت مردانه و طبعِ بلند در دلِ سنگ این دو لعلِ ارجمند
وائے من از خویشتن اندر حجاب از فراتِ زندگی نا خوردہ آب
عشقِ مرداں پاک و رنگین چون بہشت می کشاید نغمہ ہا از سنگ و خشت
بے محبت زندگی ماتم همہ کاروبارش زشت و نا محکم همہ
عشق صیقل می زند فرہنگ را جوہر آئینہ بخشد سنگ را
گرمئ افکار ما از ناز اُوست آفریدن ، جاں دمیدن کارِ اُوست[۹]

پہلے تو اس امر پر بحث کی ہے کہ غلامی سے انسان پر کیا اثر پڑتا ہے۔ غلامی سے دل مرجاتا ہے اور روح تن کو بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے۔ عالم شباب میں بھی پیری کا ضُعف چھایا ہوتا ہے۔ جب غلامی ہو تو اتفاق کس طرح سے ہو۔ سب ایک دوسرے کے خلاف کشمکش میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کا مسلک اور مقصودِ نظر ایک نہیں ہوتا۔ ہر ایک ذاتی خواہشات کو پورا کرنے میں منہمک نظر آتا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو لیڈر سمجھتا ہے۔ گویا قوم بغیر لیڈر کے ہوتی ہے۔ غلامی میں انسانی خوبیاں بھی کام نہیں آسکتیں۔ چونکہ ان کے صحیح استعمال کا امکان نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ خوبیاں آہستہ آہستہ ذائل ہو جاتی ہیں۔ بس ایک ہی بات غلام کے ذہن میں ہر وقت حاضر رہتی ہے وہ موت کا خوف ہے۔ یہ خوف اس قدر اس پر چھایا ہوا ہوتا ہے کہ گویا بے موت مرجاتا ہے اور خود ہی اپنی نعش اٹھائے پھرتا ہے۔ گویا اس کے اندر نہ ضمیر باقی ہے نہ روح۔ بظاہر وہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے مگر درحقیقت محض ایک نعش ہے۔ غلام اپنی آبرو کو بیچ دیتا ہے اور جانوروں کی طرح سے کھانے پینے کو ہی زندگی تصور کرتا ہے۔ یہ بھی کیا زندگی ہے۔ اس کے اوقات ہی اپنے نہیں۔ کسی اور کی خدمت میں وقت اور قوت کو صرف کر دیتا ہے۔

اس آرام کی زندگی اور غلامی کے بجائے اگرچہ انسان کس قدر تکلیف میں ہو، مگر آزاد ہو تو وہ بہتر ہے۔ ملک میں پیداوار اچھی نہ ہو، آسائش و آرام میسر نہ ہو، مگر جہاں پر روح آزاد ہو وہی سچی زندگی ہے۔

غلامی کے سبب تمام فنون لطیفہ کی روح بھی مرجاتی ہے۔ بلکہ غلام قوم کے پیدا کردہ شاہکاروں کا اثر جہاں جہاں پہنچتا ہے، مرگ پھیلاتا ہے۔ غلاموں کی موسیقی حیات کی گرمی سے خالی ہوتی ہے۔ غلام کی طبع پست اس کا دل بے نور اور اس کا ذوق امروز و فردا سے نا آشنا ہوتا ہے۔ اس کے نغموں سے بھی ایسی صدائیں نکلتی ہیں۔ جس سے سننے والا نحیف و ناتواں ہو جاتا ہے اور جہان عمل سے بھی بیزار ہو جاتا ہے۔ ایسے نغموں سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ چونکہ ان میں نیستی اور ہلاکت کے سوا کچھ رکھا نہیں ہے۔ ان سے دل کا سوز جاتا رہتا ہے اور اس کے بجائے غم پیدا ہو جاتا ہے جو کہ دل کے لیے زہر ہے۔

غم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک غم وہ ہے جو آدمی کو کھا جاتا ہے، دوسرا غم تمام غموں کو کھا جاتا ہے۔ اگر انسان دوسرے غم کو اپنا ساتھی بنالے تو یوں سمجھو گویا غموں سے چھوٹ گیا۔ اس کے اندر تمام دنیا کے ہنگامے سما جاتے ہیں۔ اس سے دل وسیع ہو کر ایک ناپیدا کنار سمندر بن جاتا ہے۔ مگر غلامی میں انسان کا دل اس دوسرے غم سے نا آشنا رہتا ہے اور اسے زندگی کا راز معلوم ہی نہیں ہوتا۔ وہ نغمے جو دل پر اس طرح کا اثر کرتے ہیں وہ

بیوہ عورتوں کے لیے مناسب ہیں اور غلام کی حالت بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔

راگ ایسا چاہیے جو کہ سیل کی طرح ہو اور وہ دل سے تمام غموں کو دور کر دے۔ اس سے بدن میں حرارت اور دماغ میں گرمی پیدا ہو۔ ایسا نغمہ جس سے دل منور ہو جائے، وہ گویا فطرت کا چراغ ہے۔ اس کے معانی سے اس کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس میں معنی نہ ہوں تو وہ نغمہ مردہ ہے، معنی سے مراد یہ ہے کہ وہ ظاہری نقش یعنی صورت سے تجھے آزاد کر دے۔ معنی وہ چیز نہیں جو انسان کو اندھا اور بہرہ کر دے اور صرف نقش ظاہری پر فریفتہ ہو جائے۔ مگر غلاموں کا مُطرب خود معنی کا جلوہ نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تو معنی سے دور بھاگتا ہے اور ظاہری صورت پر ہی فریفتہ ہوتا ہے۔

اب ہم غلاموں کی مُصوّری کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ غلام قوم کی نقاشی کے شاہکار ایسے ہوتے ہیں کہ نہ ان میں برا ہیمی جوش ہوتا ہے، نہ آذری تلقین۔ گویا وہ زندگی کے کسی جوش سے تعلق نہیں رکھتے۔ بس جہاں دیکھو موت کا افسانہ ہوتا ہے۔ گویا مردنی چھائی ہوئی ہے اور جہانِ عمل سے دور افتادہ۔

بے یقین انسان میں تحقیق کی لذت موجود ہوتی ہے نہ تخلیق کی قوت۔ گویا اس کے دل میں خوف موجود ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی نئے شاہکار کا پیدا کرنا محال ہے۔ اس میں نہ تو خودی ہے اور نہ مزاج میں نیا مضمون پیدا کرنے کی قوت۔ اس لیے اس کے ذوق پر عوام کی رائے کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ لوگوں نے جیسا کہا اس نے ویسا ہی بنا دیا۔ حسن کی تلاش میں مظاہر فطرت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ حالانکہ سب سے بڑا حسن تو ہماری ذات کے اندر موجود ہے نہ وہ اپنی طرف رجوع کرتا ہے۔ نہ اندرونی خوبیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ نہ وہ آزاد جذبات سے کام لیتا ہے۔ نہ اس کے دل کا دریا جوش میں آتا ہے۔ نہ وہ کوئی نئی چیز پیدا کر سکتا ہے۔

غلام قوم کے مُصوّر کے پروانے کے اندر تپش موجود ہی نہیں ہوتی کہ وہ شمع کی طرف رجوع کرے۔ نہ ہی وہ زمانۂ حال میں مستقبل کی حقیقت دیکھ سکتا ہے۔ اس کا دل خوف سے سہما ہوا ہوتا ہے اور اس لیے اس کی نگاہ بلند پرواز نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی وہ دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے خاکسار اور اپنے آپ سے شرمندہ۔ بھلا وہ بلندی کی طرف کس طرح رجوع کر سکتا ہے۔ جب اس کا فکر ہی نادار ہو اور اس میں جنگ و جدال کا مادہ ہی موجود نہ ہو۔ تو وہ اس مضمون کے متعلق تصویریں کیسے بنائے گا۔ جب انسان اپنے آپ کو اس قدر حقیر و خوار سمجھنے لگتا ہے۔ تو اس کے ضمیر میں جو خدا کا نور ہوتا ہے وہ بھی مر جاتا ہے۔ زندگی اصل میں وہی ہے۔ جس میں قوتِ اعجاز موجود ہو۔ یعنی وہ اپنی عقل و فراست سے کوئی نئی چیز پیدا کر سکے۔

وہ مصور جو فطرت کے ساتھ کچھ اور بھی اپنے نقوش میں شامل کر دیتا ہے اور وہ اپنے دل کا راز ہم پر آشکار کرتا ہے۔ وہی اصل میں صحیح مصور ہے۔ وہ ایک نئی دنیا پیدا کرتا ہے اور دل کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ اس کی پاک سرشت اچھے اور برے کو خوب سمجھتی ہے اور وہ اس کا اظہار اپنی تصاویر میں کرتا ہے۔ یہی صحیح زندگی ہے۔

غلامی میں تن جان سے خالی ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان سے آپ نیکی کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے اور ایجاد کا ذوق اس کے دل سے جاتا رہتا ہے۔ غلام تو بس تقلید کا بندہ ہوتا ہے۔ کوئی نئی روش پیدا کرنا گویا اس کے لیے کفر ہے۔ جہاں کوئی ذرا نئی بات نظر آئی، اس کے شکوک میں

اضافہ ہوا۔ پرانی فرسودہ باتیں اس کو بہت پسند آتی ہیں۔ وہ ماضی کے ہی گیت گاتا رہتا ہے اور مستقبل سے اس کا فکر خالی ہوتا ہے۔ اگر ہنر یہی ہے تو اس کا نام آرزو کی موت ہے گویا انسان کی موت ہے۔ اس مصوری کی ظاہری صورت تو بہت اچھی ہوتی ہے مگر اس کا باطن یعنی معنی بہت خراب ہوتے ہیں۔ کوئی عقلمند آدمی ظاہری صورت کو پسند نہیں کرتا، اس لیے آپ بھی اپنا راہنمانہ بنائیں۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ غلاموں کا مذہب کیا ہوتا ہے! ان کا نام نہاد مذہب تو وہ ہوتا ہے جس سے وہ پکارے جاتے ہیں۔ مگر غور کیا جائے تو حقیقت مختلف ہوتی ہے۔ عشق ہی انسان میں زندگی پیدا کرتا ہے اور اس خاکی کو سراپا آرزو اور گرمی کار عطا کرتا ہے۔ مگر غلامی میں عشق اور مذہب کے درمیان فاصلہ آجاتا ہے۔ دونوں کی پیوستگی شکستہ ہو جاتی ہے اور زندگی کی حلاوت کڑوی ہو جاتی ہے۔ خدا کی وحدت اور اس کی تمام صفات کو یقین کے ساتھ مان لینے کا نام عاشقی ہے اور پھر اسی یقین اور جوش سے معمور ہو کر ہر مشکل میں کود پڑنا یہ بھی اسی عاشقی میں داخل ہے۔ مگر غلامی میں عشق باتوں تک ہی محدود رہتا ہے اور عمل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں پڑتا ہے۔ حروف زبان سے نکلتے ہیں مگر ان پر عمل بھی نہیں کیا جاتا۔ شوق زبان تک ہی ختم ہو جاتا ہے اور بے یقین بے سبیل اور بے دلیل ہونے کے سبب سے یکسر عمل سے محروم رہ جاتا ہے۔

غلام اپنے بدن کو زندہ رکھنے کے لیے روح کو نثار کر دیتا ہے۔ اپنے دین اور دانش کو سستا بیچ دیتا ہے۔ اپنی زبان سے تو وہ خدا کا نام لیتا ہے مگر اصل میں اس کا قبلہ فرمانروا کی طاقت ہوتی ہے۔ سچے خدا کا دوسرا نام تو سچائی اور حق ہے۔ مگر دنیا کا ''خدا'' بظاہر روٹی تو دیتا ہے لیکن انسان کی سب سے قیمتی متاع ''جان'' کو ختم کر دیتا ہے۔ خدائے برتر تو جان بھی دیتا ہے اور روٹی بھی۔ مگر یہ دنیا کا خدا جان کو فنا کر دیتا ہے اور روٹی دیتا ہے۔ ''خدا واحد ہے اور یہ سو حصوں میں منقسم ہے۔ وہ سب کا چارہ گر ہے اور یہ خود بیچارہ ہے۔ یہ دنیا کا خدا جب بندے کو اپنی خدائی کا خوگر بنا لیتا ہے تو اس کی آنکھ اور کان اور ہوش کو اصل حقیقت سے کافر کر بنا دیتا ہے۔ یعنی اس کی پرورش اس روش پر ہوتی ہے کہ وہ صحیح سے انکار اور غلط پر اصرار کرتا ہے۔ غلام زندہ ہوتا ہے مگر اس میں جان نہیں ہوتی۔ یہ امر ذرا تشریح طلب ہے کہ انسان کسی طرح سے زندہ بھی ہو اور پھر بھی وہ مردہ ہو یا مردہ کہلانے کا مستحق ہو۔

زندگی اور موت دو اعتبار ہیں جو ہمارے احساس پر مبنی ہیں۔ مچھلیوں کے لیے پہاڑ اور صحرا نہ ہونے کے برابر ہیں اور پرندوں کے لیے سمندر کی گہرائیاں کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ بہرہ آدمی گرمیٔ نوا کے لحاظ سے مردہ ہے۔ گویا آواز کے اعتبار سے وہ زندہ نہیں۔ اس طرح اندھا رنگوں سے بہرہ اندوز ہونے سے محروم ہے اس لحاظ سے وہ مردہ ہے۔ مگر نغمہ کی رو سے وہ زندہ ہے تو اس طرح کہ وہ روح جس کے ساتھ حق مربوط ہو زندہ ہے ورنہ مردہ۔ حیات کے معنی یہی ہیں کہ وہ پیوستہ بحق ہو ورنہ وہ مردار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ایسے مردہ انسان کی نظر سے تمام حقائق پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس کا دل بے ذوق ہوتا ہے اور اس میں انقلاب کا شوق نہیں ہوتا نہ اس کے عمل میں سوز ہوتا ہے نہ اس کی گفتگو میں نور۔ اس کا مذہب بھی اس کے فضا کی طرح تنگ نظر ہوتا ہے۔ زندگی اس کے لیے گویا ایک بار ہوتی ہے۔ اپنی موت کی وہ اپنے پہلو میں خود ہی پرورش کرتا رہتا ہے اس

کی صحبت سے عشق کو بہت اذیت پہنچتی ہے اور اس کے دم سے کئی محفلوں کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس ننھے سے کیڑے کے لیے جو پھول سے نکل کر کبھی بلند نہ ہوا آسمان اور چاند اور سورج بے معنی باتیں ہیں۔

غلام سے نہ تو یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اس میں ذوق دیدار ہو گا نہ یہ کہ اس کی روح بیدار ہو گی۔ اس کی آنکھ حقیقت اشیا کو دیکھنے کی محنت کش ہی نہیں ہوتی۔ وہ تو بس اتنا کرتا ہے، کہ کھایا، خواب گراں میں اوقات بسر کیئے، موت آئی اور مر گیا۔ حکمران اگر اس کا ایک بند کھولتا ہے تو دس اور لگا دیتا ہے، کہ یہی تیرے لیے مفید مطلب ہیں۔ گویا ان گرہوں سے تیرے لیے زرہ تیار کی گئی ہے۔ جو تیری حفاظت کرے گی۔ مگر ہوتے وہ بند ہیں۔ پھر اس پر اپنے قہر اور کینے کا اظہار کرتا ہے۔ جس سے غلام کے دل میں موت کا ڈر بڑھ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ غلام اپنے آپ سے ناامید ہو جاتا ہے۔ اور اس کے سینے سے آرزو مٹ جاتی ہے۔

کبھی حکمران یہ بھی کرتا ہے کہ غلام کو خلعتِ زیبا عطا کرتا ہے اور کچھ تھوڑا بہت جزوی کاروبار بھی اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ مگر اپنے مطلب کو اور مضبوط کر لیتا ہے۔ دنیا کی نعمتیں جو غلام کو زمانۂ حال میں میسر آتی ہیں۔ وہ مستقبل سے اسے منکر بنا دیتی ہیں۔ حکمران کی مہربانی میں اس کا جسم تو پھول کر کُپا ہو جاتا ہے مگر روح سوکھ کر تنکے کی طرح ہو جاتی ہے۔ حکمران کے بند صرف محکوم کے پاؤں میں نہیں ہوتے بلکہ اس کا دل اور روح بھی اس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بڑی مشکل یہی ہے چونکہ ان کا احساس اور پھر ان سے مخلصی آسان کام نہیں ہے۔

یہاں تک تو ہم نے غلاموں کی صفات کو دیکھا اور یہ جانا کہ ان میں کون کون سے نقائص حکمران کی سیاست پیدا کرتی ہے۔ اب یہ دیکھنا مقصود ہے کہ آزاد مردوں کی تربیت کس روش پر ہونی چاہیے۔ کس طریقہ سے قوم کو آزاد کیا جا سکتا ہے۔ تربیت ہی ایسی ہو کہ مرد میں آزادی اور استقلال کی خواہش اور ان کے حصول کی صفات موجود ہوں، اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندرونی جوہروں کی تربیت کرے اور ان کو برسرِ کار لانا سیکھے۔

آزاد مردوں کے ضمیر کی تربیت اسی طرح ہوتی ہے کہ ان کا دل تو سخت اور مضبوط ہوتا ہے مگر ہمت مردانہ اور طبع بلند موجود ہوتی ہے۔ جو انسان اپنے آپ کو نہیں پہچانتا یعنی اپنی منزلت اور انسانی وقار سے آگہی نہیں حاصل کرتا، وہ کبھی زندگی کی لذتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ یہ سب باتیں یقین محکم سے حاصل ہوتی ہیں۔

عشق کا دل میں پیدا کرنا ضروری ہے۔ عشق وہ جو بہشت کی طرح سے پاک اور رنگیں ہو۔ یہی مردوں کا عشق خوبصورتی کو پرکھتا ہے۔ اس کا محافظ بھی ہے اور پردہ دار بھی۔ یہ عشق کیوں اور کس طرح کے اصول پر نہیں سوچتا۔ بلکہ جب کوئی کام کرنے پر آتا ہے، تو اس کی ہمت آسمان کے دوسرے پار نکل جاتی ہے۔ اس کی کیفیتوں کو بیان نہیں کیا جا سکتا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ ایسا عشق اپنے ضمیر کو بے نقاب کرتا ہے اور اپنی تمام قوتوں کو عمل میں لاتا ہے۔

ہمت سے کئی جذبات بلند ہوتے ہیں اور کم ہمت بھی جرأت سے معمور ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ

عشق و محبت کے بغیر زندگی ایک طویل ماتم معلوم دیتی ہے اور تمام کاروبار کمزور اور حقیر ہو جاتا ہے۔ عشق سے عقل اور علم صیقل ہوتے ہیں اور مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ اسی کے سبب ہمت بلند ہو جاتی ہے اور ہنر مند اپنے بہترین شاہکار پیدا کر سکتے ہیں۔

عشق کے سامنے رکاوٹیں ہیچ ہیں۔ جب وہ کام کرنے پر مائل ہو جاتا ہے تو کر کے ہی رہتا ہے اسی کی گرمی سے ہمارے فکر میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور جان اور روح پرورش پاتے ہیں۔ انسان اپنے اندر کسی چیز کے سرانجام دینے کا عشق پیدا کرے تو وہ اسے کر کے ہی رہتا ہے مگر عشق وہ ہونا چاہیے جو انسان کے دل میں اور دوسروں پر غالب رہنے کی صفت پیدا کرے۔ اگر دنیا کے دل کسی ایسے مرکز کی طرف متوجہ ہوں جو ان میں غالب اور زبردست رہنے کی صفت نہ پیدا کر سکے تو اس کا نام جادوگری ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا جذبہ وجود میں آئے جو جاذبِ توجہ بھی ہو اور اس کے ساتھ غالب اور زبردست رہنے کی صفت بھی پیدا کرے تو وہ پیغمبری ہوتی ہے، دونوں حالتوں میں عشق کارفرما ہوتا ہے۔

یہ بحث باوجود میری خواہشِ اختصار کے کچھ طویل ہو گئی ہے۔ تاہم میں نے وقت کم صرف کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ موضوع ''نظریہ'' تھا اور وہ تمام باقی مضمون کے لیے اساس کا کام دیتا ہے۔ اس لیے بیان کرنا پڑا۔ اب ان خیالات کو عملی جامہ پہنانا منظور ہے اور پیشِ نظر مشرق ہے۔ خاص طور پر مشرق کے اسلامی ممالک اور ہندوستان ہے۔ تو دیکھیے کہ ان قوموں کو افرنگی سیاست سے آزاد ہونے کے لیے کیا کام کرنا چاہیے۔

''شکوہ'' نے اقبال کی شاعری کو بہت شہرت دی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جگا دیا۔ پھر ''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' نے اس میں اضافہ کیا۔ ولایت سے آنے (۱۹۰۸ء) کے بعد سے اقبال نے اسلامی اخوت کا پیغام تمام دنیا کو پہنچانا شروع کیا۔ مطلب یہ تھا کہ تمام عالم کے مسلمان ایک ہو جائیں۔ کعبہ ان کا مرکز ہو۔ وہ اپنی اپنی قومیت کو کھو دیں اور اپنے مخصوص وطن افغانستان، ایران توران کو بھول جائیں صرف اور صرف اسلام کے نام میں اپنے نام اور حیثیتیں گم کر دیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خون، مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر[۱۰]

اب ترانہ ہندی کی بجائے ترانہ ملّی پیش نظر تھا (ترانہ ملّی)

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا[۱۱]

ہندوستان کی بات نہیں اب سارے جہان کا ذکر ہونے لگا۔ اقبال کا یہ کہنا ہے کہ وطن کی محبت پیدا کرنے کے بجائے اسلام کی محبت پیدا کرو۔ چونکہ وطن کی محبت پیدا کرنے سے مذہب کی محبت مر جاتی ہے۔

''وطنیت''

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لُطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ ترا شیدۂ تہذیب نوی ہے
غارتِ گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیّتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے[۱۲]

اقبال نے یہ بھی دیکھا کہ مشرقی اقوام سو رہی ہیں اور مغرب کے سیاست دان اُن کے حصے بخرے کر کے کھا رہے ہیں۔ جس طرح سے گدھ لاشوں کو کھاتے ہیں۔ اقبال کو اس نظارے سے دلی رنج ہوا اور اس نے قوموں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانا شروع کر دیا گیا۔

چونکہ مضمون اسلام تھا۔ اس لیے زیادہ توجہ اسلامی ممالک کی طرف ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ اسلام کی پشت پناہ، ایک جلیل القدر تاریخ بہت وسیع اور شاندار قومی کارنامے اور عظیم الشان قربانیوں کی مثالیں موجود ہیں۔ جس کی روشنی میں کسی وقت اور کسی پہلو سے اسلام کے متعلقہ مضمون کو پُرنُور کیا جا سکتا ہے۔ اقبال جیسے فاضل کے لیے مضمون کو زور گوہر سے معمور کر کے چرخ چہارم بنا دینا آسان بات تھی۔

تمام ملّت اسلامیہ یعنی اسلام بحیثیت مجموعی محاورہ ہے۔

اے ترا حق خاتم اقوام کرد بر تو ہر آغاز را انجام کرد

اے نظر بر حُسن تر سازادهٔ　　اے ز راه کعبه دُور افتادهٔ
طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش　　تازه کُن با مصطفیؐ پیمانِ خویش
تا نگاہے افگنی بر رُوئے خویش　　می شوی زنجیری گیسوئے خویش
باز خوانم قصهٔ پارینه ات　　تازه سازم داغہائے سینه ات
از پئے قومِ زخود نا محرمے　　خواستم از حق حیات محکمے
عشق را داغے مثالِ لاله بس　　در گریبانش گلِ یک ناله بس
تا زخاکت لاله زار آید پدید　　از دمت بادِ بہار آید پدید[۱۳]

اسلام آسمانی مذاہب کی آخری کڑی ہے اور اس میں تمام صفات موجود ہیں جو اس سے پہلے مذاہب میں فرداً فرداً موجود تھیں۔ مگر مسلمان کی حالت بہت پست ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب اور روایات سے دور ہٹ گیا ہے۔ مسلمان نے اپنے دل میں عیسوی موسوی اور دیگر اقوام اور ان کے ادبیات کی محبت پیدا کر لی ہے۔ رسول عربی ﷺ کا عشق ہی مسلمانوں کے لیے کامیابی کا راستہ ہے۔ تم اپنے آپ سے اس قدر غافل کیوں ہو گئے ہو۔ میں تمہیں پرانی عظمت یاد دلاؤں گا اور اُس عشقِ نبویؐ اور ایمانِ محکم کی طرف مائل کروں گا تاکہ تمہارا مستقبل روشن ہو، کامیاب ہو اور تم دنیا میں آزادہ کر صاحبِ طاقت و سلطنت بن سکو۔ ''بال جبریل'' میں ''ساقی نامہ'' لکھا ہے۔ اس میں اس معاملے کو زیادہ واضح کر دیا ہے اور رموز کا اضافہ بھی کیا ہے۔

زمانے کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش　　مگر دل ابھی تک ہے زُنّار پوش
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے
شرابِ کُہن پھر پلا ساقیا　　وہی جام گردش میں لا ساقیا!
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے
امنگیں مری آرزوئیں مری　　اُمیدیں مری، جستجوئیں مری
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرهٔ کائنات

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز　　سفر ہے حقیقت ، حضر ہے مجاز
خودی کیا ہے ، رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے ، بیداریٔ کائنات
خودی کے نگہباں کو ہے زہرناب　　وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند　　رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
تری آگ اس خاکدان سے نہیں　　جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود　　کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا　　تری شوخیٔ فکر و کردار کا
تو ہے فاتحِ عالم خُوب و زِشت　　تجھے کیا بتاؤں تیری سر نوشت[۱۴]

مغربی تہذیب کے لیے اقبال یہ کہتا ہے: (خرابات فرنگ)

ایں خراباتِ فرنگ است و ز تاثیر مئیش　　آنچہ مذموم شما رند ، نماید محمود
نیک و بد را بتر ازوے دگر سنجیدیم　　چشمۂ داشت تر از وے نصاریٰ و یہود
خوب، زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست　　زشت، خوب است اگر تاب وتوانِ تو فزود
تو اگر درنگری جز بہ ریا نیست حیات　　ہر کہ اندر، گرو صدق و صفا بود و نبود
دعویٔ صدق و صفا پردۂ ناموسِ ریاست　　پیرِ ما گُفت مَس از سیم بباید اندود
فاش گفتم بتو اسرارِنہان خانۂ زیست　　بکَسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود[۱۵]

مغربی اقوام ریاکاری، حیلہ سازی اور مادی ایجادات کے زور پر اپنا الّو سیدھا کر رہی ہیں اور مشرق کی سادہ لوح اقوام کو نوچ نوچ کر کھا رہی ہیں۔ انہوں نے یہ ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ المُلُوک
سلطنت اقوامِ غالِب کی ہے اِک جادو گری[۱۶]

مغربی تہذیب سرمایہ داری پر مبنی ہے اور اقبال سرمایہ داری کے خلاف ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگون کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے[۱۷]

''خضرِ راہ'' میں اس مضمون پر بحث ہے۔ کہ سرمایہ داری سے تہذیب کی بنا کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ پھر اس امر کو بھی واضح کیا کہ جب سیاست دین سے خالی ہو جاتی ہے۔ تو وہ محض ہوس اور ظلم کا میدان بن جاتی ہے۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نا مرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیمن کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری!
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی

کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری[۱۸]

یورپ نے جو ظاہرداری کا مذہب اپنا رکھا ہے۔ وہ دین نہیں بلکہ سیاست کا ایک حصہ ہے۔ دین میں وہ عناصر موجود ہی نہیں جن سے یہ صحیح دین کہلانے کا مستحق ہو اور پھر اس کا اثر سیاست پر نہیں ہوتا بلکہ سیاست اسے بطور آلۂ کار استعمال کرتی ہے۔

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسیا کے سفیر[۱۹]

اور اب عالمِ اسلامی کو اقبال نے آواز دے دے کر جگانا شروع کیا۔

عام حُریّت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تُو اُس خواب کی تعبیر دیکھ[۲۰]

اور انھیں کہا کہ اٹھو! تمہارے جاگنے کا وقت آ گیا ہے۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عُروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
طلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی[۲۱]

یہ بڑے شُکر کی بات ہے کہ اقبال کی زندگی میں ہی اس کے پیغام نے اثرات نمودار ہونے لگے۔ ہر طرف بیداری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

اقبال نے اس امر پر زور دیا کہ آزادی اور استقلال کے لیے خودی کا پیدا کرنا ضروری ہے اور خودی عشق و محبت سے ہی محکم ہوتی ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود
قُوّتش فرماندۂ عالم شود[۲۲]

''خودی'' تعمیر قوم کے لیے اس قدر ضروری عُنصر ہے کہ اس کا زندگی کے ہر شُعبہ میں شامل کرنا ضروری ہے۔ مذہب، تعلیم، ادب، موسیقی، مصوری، سماجی رسوم غرضیکہ فرد کی ہر نقل و حرکت سے یہ ثابت ہو کہ اس کی قوم گرانمایہ، قوی، صاحبِ دل و دماغ پُر از شوکت و ہمّت ہے۔

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہُنر

گُہر ہیں ان کی گِرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسُون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمّتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ[۲۳]

جب افراد کا ملک ایک ہو جاتا ہے تو ملّت بن جاتی ہے۔ فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملّت کی حفاظت کرے۔ چونکہ اسی میں اس کی حفاظت کا راز مضمر ہے۔ ملّت کی تکمیل کے لیے نبُوّت کی وساطت ضروری ہے۔

تا خدا صاحبدلے پیدا کُندَ
کو ز حرفے دفترے اِملا کُندَ
ساز پردازے کہ از آوازۂ
خاک را بخشد حیاتِ تازۂ[۲۴]

پھر اقبال یہ کہتا ہے کہ تمام بنی نوع آدم کو غلامی کی زنجیروں سے چھڑانے کے لیے ایک ہی مذہب ہے اور وہ اسلام ہے۔ پیغمبرؑ اسلام آزادی حریّت اور مساوات کا پیغام لے کر دنیا میں آئے۔

بود انسان در جہاں انسان پرست ناکس و نابود مندو زیر دست
از غلامی فطرت او دون شدہ نغمہ ہا اندر نئے اُو خون شدہ
تا امینے حق بحقداران سپرد بندگان را مسند خاقان سپرد
قوتِ او ہر کُہن پیکر شکست نوعِ انسان را حصارِ تازہ بست
حریّت زاد از ضمیر پاک او ایں مئے نوشین چکید از تاک او
نقش نو بر صفحۂ ہستی کشید اُمّتے گیتی کشائے آفرید
کائنات از کیفِ او رنگین شدہ کعبہ ہا بُت خانہ ہائے چین شدہ
کُلُّ مُؤمِنٌ اِخْوَۃٌ اندردلش حریّت سرمایۂ آب و گلش
نا شکیبِ امتیازات آمدہ در نمادِ اُو مساوات آمدہ
ہمچو سرو آزاد فرزندانِ اُہ پختہ از قَالُوا بَلٰی پیانِ اُو[۲۵]

مسلمانوں کا ایک ملّت پیدا کرنے کے لیے قرآنِ پاک پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

تو ہمیں دانی کہ آئینِ تو چیست

زیر گردوں سرِّ تمکین تو چیست
آن کتابِ زندہ ، قرآن حکیم
حکمت اُو لا یزال است و قدیم
ارج می گیرد ازو نا ارجمند
بندہ را از سجدہ سازد سر بلند[۲۶]

عام مسلمانوں میں خدا کی رضا اور قسمت کے نوشتے کے بارے میں عجیب خیالات پھیلے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہی ہو کے رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ہمیں علم نہیں اور کیا پتا کیا ہو کیا نہ ہو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ بلکہ کوشش اور محنت ہمیشہ جاری رہے۔ سبب کو ترک نہیں کرنا چاہیے اور ترقی کے لیے جو امور ضروری ہیں انھیں محنت سے حاصل کرنا چاہیے۔

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظُلمت کدۂ شاخ پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنون نشود نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہ عمل بند
مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا
جُرات ہو نُمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا! ملکِ خدا تنگ نہیں ہے[۲۷]

گویا اس تسلیم و رضا کے غلط نظریہ کو جو عام طور پر مسلمانوں میں مُروّج ہے بدل دیا جائے اور انھیں کوشش محنت، تعلیم اور خودی کی طرف راغب کیا جائے تا کہ وہ اپنے اندر قوت و ہمت پیدا کریں۔

اسلام کی توسیع اور تکمیل اس امر میں ہے کہ وہ مادی ترقی کرے اور دنیا پر غالب آنے کی کوشش کرے۔

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرّۂ تعمیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر
تختۂ تعلیم اربابِ نظر
سینہ را از سنگ زورے ریش کُن
امتحان استخوانِ خویش کُن
حق جہان را قسمت نیکاں شمرد

جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
کارواں را رہگذار است ایں جہاں
نقد مومن را عیار است ایں جہاں
گیر اُو را ، تا نہ او گیرد تُرا
ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا[۲۸]

اب اسلامی اقوام کے افراد نے وہ عناصر اپنے اندر داخل کر لیے جو آزادی اور طاقت کی تخلیق کرتے ہیں۔قوموں نے خودی اور سیاست کا سبق سیکھ لیا۔مگر جب تک ان میں اتحاد موانست اور باہمی ہمدردی کی ضمیر پیدا نہ ہو وہ بیرونی دشمنی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔آج کل کی دنیا اس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے اور یورپ کے زیر تکمیل اقوام کے خلاف ایسا اتحاد قائم کیا ہے کہ مشرق (جس سے مقصود مشرق کے اسلامی ممالک ہیں) جب تک کہ وہ تمام تر متحد نہ ہو جائے مغرب کی سیاست کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔مغربی اقوام نے باوجود اپنی باہم آویزشوں کے ایک انجمن بنام جمعیت الاقوام بنائی۔جس سے مقصود یہ تھا کہ آپس میں جو کچھ ہو سو ہو۔لیکن غیر اقوام کو ہم سب بانٹ بانٹ کر اپنے قبضے میں کریں گے۔اس کے علاوہ اور کوئی مقصود مشترک نہ ہو۔مگر یہ تو سب کے لیے باعث توجہ ہے اس وقت کی جمعیت الاقوام کے لیے کہا ہے، جب اس کی تشکیل کی گئی تھی۔

برفتد تا روش رزم درین بزمِ کُہن
درد مندانِ جہان طرحِ نو انداَختہ اند

(ظاہر داری یہ ہے)

من ازین بیش نہ دانم کہ کفن دز دے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند[۲۹]

(حقیقت یہ ہے)

نو اسلامی ممالک کو اقبال نے مشورہ دیا کہ وہ بھی باہمی اشتراک پیدا کریں۔بلکہ ان میں تو مذہب کی بنا پر اور اس کی رو سے پہلے سے ہی اتحاد اخوت اور جذبۂ ہمدردی موجود ہے۔اگر تمام اسلامی ممالک ایک جمعیت الاقوام بنا لیں۔تو یہ کامیاب ہو جائیں گے۔چونکہ اسے متحدہ کارفرما ہونے کے ضروری عناصر اسلام میں موجود ہیں اور اس کا مرکز ایران کا پایۂ تخت طہران ہو۔یہ روش اگرچہ مغرب کی نکالی ہوئی ہے۔مگر مشرق میں غالب ہے کہ اس کو حقیقی عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے[۳۰]

اقبال غلامی سے آزاد ہونے کا جو راستہ بتاتا ہے۔وہ ایمان محکم ہے۔

ثباتِ زندگی ایمانِ مُحکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامین پیدا
ولایت پادشاہی علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایمان کی تفسیریں
یقین محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں[۳۱]

اب اقبال نے اپنی دنیا کو آزادی کا پیغام دینا شروع کیا۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی[۳۲]

آزادی کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ بہت سی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔

برتر از اندیشۂ سُود و زِیان ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی[۳۳]

زندگی محض حیات کا نام نہیں بلکہ بعض دفعہ جان قربان کر دینے کا نام ہے اور اس سے ملّت زندہ رہ سکتی ہے۔

اقبال نے دیگر اقوام کے نام الگ الگ پیغام بھیجا۔ تا کہ وہ اپنے خواب غفلت سے جاگ اٹھیں مغرب کے دھوکے سے بچیں اور شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں۔ جس سے وہ استقلال اور ترقی حاصل کر سکیں۔

ہندوستان کے ہندوؤں کے نام نیا شوالہ کے نام سے پیغام بھیجا۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے[۳۴]

ہندوؤں نے اس پیغام کو سن کر اپنی ظاہری اور باطنی تعمیر و تشکیل شروع کر دی اپنی فکر کی تطہیر کی، ذرا دیکھیے اس تیس سال کے عرصہ میں ہندو جاتی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ صدیوں کے فرسودہ رواج و رسوم کو بھی ترک کر دیا ہے۔ جو مذہب کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔ شدھی شروع ہو گئی۔ چھوت جاتی رہی۔ ودھوا عورتوں کا وداع ہونے لگا۔ سات ساگر پار جانے کا رواج ہو گیا۔ کھانے میں ممنوع چیزوں کا پرہیز جاتا رہا۔ گویا دنیا ہی بدل گئی۔ صنم کدے کے بُت جو پرانے ہو گئے تھے برہمن نے بدل تو دیئے مگر اقبال کا نیا شوالہ نہ بن سکا۔ جس سے یہ کہا جا سکتا کہ:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۳۵

ممکن ہے۔ کہ اقبال کی یہ آرزو بھی آئندہ پوری ہو جائے۔

مشرق کی تمام اقوام کے نام جو پیغام ہے اس کتاب کا نام ہے ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' مشرقی اقوام سے مقصود اسلامی اقوام ہیں۔ جو مشرق میں آباد ہیں۔ تفصیل کا یہ محل نہیں حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ہر کتاب کو اصل صورت میں مطالعہ کرنا ضروری ہے تا کہ مفہوم کو سیاق وسباق کے ساتھ ذہن نشین کیا جا سکے۔

مطلب یہ ہے کہ مشرقی اقوام مغرب سے نجات پائیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے تطہیرِ فکر کی تلقین کی ہے چونکہ اس کے بعد تعمیرِ فکر آسان ہو جاتی ہے۔ پھر نبوّت کی حکمت پر بحث کی ہے کہ اس سے کس طرح سے عزم وتسلیم ورضا والی اُمّت پیدا ہوتی ہے۔ جو عشق وحُسن سے اپنا چراغ روشن کرتی ہے اور اپنا نیا جہاں رضائے حق کے مطابق تعمیر کر لیتی ہے۔ اس کے برخلاف حکمتِ سلاطین ہے۔ جو مکروفن پر مشتمل ہے۔ وہ دوسری قوموں کو غلام بنانے میں اپنی فراست کو صرف کرتی ہے۔ لا اور الّا یعنی نفی اور ثبات سے نئی قوم تعمیر ہو سکتی ہے اور وہ جملہ موجودات پر حاوی ہو جائیں گی۔ فقر کے معنی ذوق وشوق اور تسلیم ورضا کے ہیں۔ اس سے دین کی حکمت اور قوت بڑھتی ہے۔ فقر کی قوت سے مومن جہاں فتح کر لیتا ہے۔ مومن کا فقر اسے خودی کا سبق پڑھاتا ہے آزاد مرد موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ فرنگ کا عبد نہیں بلکہ اپنا عبد ہوتا ہے اور اپنی قوتوں کو اپنی تعمیر میں صرف کرتا ہے۔ مال ودولت کو دین کے کاموں میں صرف کرنا چاہیے۔ نہ کہ خرافات میں۔ حلال وحرام میں تمیز لازمی ہے۔ منعم زر کا غلام ہونے کے سبب انقلاب سے ڈرتا ہے۔ یورپ اس نکتہ سے بے بہرہ ہے۔ غریب ہندوستان آپس کی آویزش میں گرفتار ہو کر دوسروں کا غلام بن گیا۔ موجودہ سیاست ایسی پیچیدہ ہوگئی ہے کہ وہ غلام کو اور غلام بنا رہی ہے اور اس کے لیے سینکڑوں طریقے استعمال کرتی ہے۔ اے مسلمان تو کب تک اس بند مین گرفتار رہے گا۔ آزادی کے لیے کوشش کر۔ آزاد مرد کا ایمان بھی پختہ ہوتا ہے غلام ان کے جلال سے باخبر ہیں نہ لذّتِ ایمان سے:

عید آزاد ان شکوہِ مُلک و دین
عید محکومان ہجومِ مُومنین۳۶

افرنگی افسون میں کئی فتنے پنہاں ہیں۔ ان سے آزاد ہونے کی سعی کرنی چاہیے۔ یورپ کے فساد سے اب زمانہ پریشان ہو گیا ہے اور مستقبل کی باگ اب مشرق کے ہاتھ میں ہوگی۔

آدمیت زار نالید از فرنگ زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوام شرق باز روشن می شود ایّام شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید شب گزشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد زیرِ گردوں رسم لا دینی نہاد۳۷

پھر اسی مثنوی میں یہ کہہ کر بات کو واضح کر دیا۔

تا بروز آرم شبِ افکار شرق — بر فرو زم سینۂ احرار شرق
از نوائے پختہ سا زم خام را — گردشِ دیگر دہم ایّام را
فکر شرق آزاد گردد از فرنگ — از سرودِ من بگیرد آب و رنگ
زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس — حریّت از عِفّتِ فکر است و بس
چون شود اندیشۂ قومے فراب — ناسرہ گردد بدَستش سیم ناب
میرد اندر سینۂ اش قلبِ سلیم — در نگاہِ اُو کج آید مستقیم
بر کراں از حرب و ضربِ کائنات — چشم او اندر سکون بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند — گوہر اُو چون خزف نا ارجمند
پس نخستیں با یدش تطہیرِ فکر — بعدازاں آسان شو و تعمیرِ فکر[۳۸]

اس کا یہ مطلب ہوا۔ کہ حالت بدلنے کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنی فکری طہارت پیدا کرے اس کو صاف اور صیقل کرے۔ اسے نئے سانچے میں ڈھالے۔ تو باقی کام آسان ہو جائیں گے۔

اسی مثنوی میں ہندوستان کا رونا بھی رویا ہے۔

اے ہمالہ اے اٹک اے رُودِ گنگ
زیستن تا کے جہاں بے آب و رنگ؟
پیر مردان از فراست بے نصیب
نوجوانان از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خِشت ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

اُمّتے کز آرزو نیشے نہ خورد
نقشِ اُو را فطرت از گیتی سترد[۳۹]

ہندوستان میں حرکت پہلے سے تھی۔ مگر اقبال کے الفاظ نے ایک تازہ جوش پیدا کر دیا۔

مثنوی مسافر میں جہاں افغانستان کے نام پیغام ہے، وہاں ہمسایہ ملک ہونے کے سبب ضمناً ہندوستانی مسلمان کا بھی ذکر آ گیا ہے۔

مسلم ہندی چرا میدان گذاشت؟
ہمت اُو بوئے کرّاری نداشت
مُشتِ خاکش آنچناں گردیدہ سرد
گرمیٔ آوازِ من کارے نکرد![۴۰]

اصل میں ہندوستان کا اسلام عجیب مصیبت میں گرفتار ہے۔ جو کہیں خطۂ عالم میں نظر نہیں آتی۔ یعنی

اس کے حالات اور اس لیے تکالیف مخصوص ہیں۔ ادھر غیر قوم کی حکومت دوسری طرف غیر مذہب کا دباؤ اور ان کا ساتھ۔ پھر اسلامی مذہب کا ملاؤں کے ہاتھوں تنزل اور ملّت کے اندر فرقہ بندی۔ اس تمام انتشار اور ابتزال کے ساتھ ترقی اور حصول آزادی کی خواہش گم۔ گویا ضمیر میں انکساری موجود اور خودی غائب

وائے نا کامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا[۴۱]

اقبال ہندی مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

غدّارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلمان کو گدا گر[۴۲]

(احمدی پارٹی رقادیانی)

پنجاب کے اربابِ شریعت کی نبوّت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر
آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکینِ دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر![۴۳]

پھر ان کو یہ بھی بتایا ہے کہ جب تک اپنے ہاتھوں میں قوت نہ ہو دین کی کبھی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ فاتح کے سامنے عقل، نظر علم و ہنر سب جُھک جاتے ہیں۔ آزادی کے بل بوتے پر دین زندہ رہ سکتا ہے۔ قوّت کے متعلق لکھا ہے کہ:

اس سیل سُبک سیرو زمین گیر کے آگے
عقل و نظر و عِلم و ہُنر ہیں خس و خاشاک
لا دیں ہو تو ہے زہر ہلا ہل سے بھی بڑھ کر
ہو دین کی حفاظت میں تو ہے ہر زہر کا تریاک[۴۴]

بلکہ یہ کہ اسلامی نبوّت ہی قوت وشوکت کا پیغام ہے۔ اگر کسی مسلمان کا ضمیر ہی اس کے خلاف ہو تو وہ صحیح شریعت اسلامی کا پابند نہیں۔

وہ نبوّت ہے مسلمان کے لیے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوّت و شوکت کا پیام[۴۵]

اس امر سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آزادی خودی اور قوت کا سبق بچپن سے ہی دینا چاہیے اور اس لیے مدارس میں تعلیم ایک خاص روش پر ہونی چاہیے جو ہندوستان میں جاری نہیں۔

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے مُنوّر

محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات[۴۶]

مدرسوں میں چاہیے کہ بچوں کی تعلیم ایسی ہو جس سے وہ اپنے اندر آزادی کی روح پیدا کر سکیں۔ صرف حکمت کے مقالے نہ رٹائے جائیں۔ بلکہ آزاد مرد بننا سکھایا جائے۔

افغانستان کے نام ایک پیغام تو اس وقت بھیجا تھا جب جس وقت امان اللہ خان کی حکومت تھی جو پیشکش کے زیرِ عنوان پیامِ مشرق کے شروع میں درج ہے۔امیر افغانستان کو مخاطب کر کے کہا:

عشق را آئین سلمانی نہ ماند　　خاکِ ایران ماند و ایرانی نہ ماند

تازہ کن آئینِ صدیقؓ و عمرؓ　　چوں صبا برلالۂ صحرا گزر

جان تو بر محنت پیہم صبور　　کوش در تہذیبِ افغانِ غیور

زندگی جہد است و استحقاق نیست　　جُز بعلمِ انفس و آفاق نیست

علم و دولت نظم کارِ ملّت است　　علم و دولت اعتبارِ ملت است

سروری در دین ما خدمت گری است　　عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است

آن مسلمانان کہ میری کردہ اند　　در شہنشاہی فقیری کردہ اند

ہر کہ عشق مصطفیٰؐ سامانِ اوست　　بحر و بر در گوشۂ دامانِ او است

خیز و اندر گردش آور جامِ عشق　　در قہستان تازہ کن پیغامِ عشق[۴۷]

ملّت افغانی نے اس مسلک پر گامزن ہو کر ترقی کی۔ پھر جب نادر شاہ کا زمانہ آیا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے افغانستان کا سفر کیا۔ دعوت نامہ تو امیر نادر شاہ نے بھجوایا تھا مگر افغانستان جانے تک وہ شہید ہو گیا اور اس کا بیٹا ظاہر شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس وقت کی یادگار ''مسافر'' ہے۔ اس میں بھی افغانستان کے مستقبل کا لائحہ عمل بتا گیا ہے۔ ترقی اور آزادی کا راستہ دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ امیر جواں سال افغانستان سے خطاب کیا ہے۔

روز و شب آئینۂ تدبیر ماست　　روز و شب آئینۂ تقدیر ماست
باتو گویم اے جوانِ سخت کوش　　چیست فردا ؟ دُخترِ امروز و دوش
ہر کہ خود را صاحب امروز کرد　　گرد او گردد سپہر گرد گرد
چوں پدر اہل ہنر را دوست دار　　بندۂ صاحب نظر را دوست دار
ہمچوں آن خلد آشیان بیدارزی　　سخت کوش و پُردم و کرّار زی
روز ہا شب ہا تپسیدن می تو ان　　عصرِ دیگر آفریدن می تو ان
صد جہاں باقی است درقرآن ہنوز　　اندر آیا تش یکے خود را بسوز
باز افغان را ازآن سوزے بدہ　　عصر او را صبح نو روزے بدہ
برگ وسازِ ما کتاب وحکمت است　　این ود قوت اعتبار ملّت است
حکمت اشیا فرنگی زاد نیست　　اصلِ اُو جز لذّتِ ایجاد نیست
لیکن از تہذیب لا دینے گریز　　ز ان کہ او با اہل حق دارد ستیز
بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
با مسلمانان غمے بخشیدہ ام　　کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام[۴۸]

یہ ہے اقبال کا پیغام ۔ ملّتِ اسلامی یا مسلمان اقوام جو پستی میں گری ہوئی ہیں اس کا سبب کیا ہے۔ ہماری تدبیر پر ہماری قوت یا شوکت منحصر ہے اور ہمارا مستقبل حاضر پر۔ جتنی کوشش ہم عہد حاضرہ میں کریں گے اس کے مطابق آئندہ ہمارا وقار یا طاقت بڑھے گی ۔ مردِ حق اس تمام کامیابی کا راز ہے۔ چونکہ وہ اپنی تقدیر خود بنا تا رہتا ہے۔ بادشاہ کو یہ چاہیے کہ اہل ہنر اور صاحبِ نظر پر ہمیشہ مہربانی کیا کرے۔ چونکہ ترقی اسی سے ہوسکتی ہے۔ انسان کو چاہیے، کہ وہ سخت کوش ہو۔ لگا تار جفاکشی کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور کرّار ہو۔ کرّاری علیؓ کے مقامات میں سے ایک ہے۔ ترک یا ہندی مسلمان جب کرّاری بھول گئے تو دوسری قوموں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ تم ایک نیا جہان بناؤ۔ مگر اس کی بنا قرآن پر ہو۔ ملّتِ افغانی کو ایک نیا طریق سکھاؤ اور انھیں میدانِ عمل میں لا کر مردِ میدان بننے کا سبق دو۔ قرآن اور سائنس (حکمت اشیاء) یہی دو قوتیں ہیں۔ جو ملّت کی بنا کو مستحکم کرتی ہیں ۔ سائنس فرنگستان میں پیدا نہیں ہوتی ۔ بیج تو مسلمانوں نے بویا تھا۔ مگر افرنگیوں نے اس کے حصول سے فائدہ اٹھایا۔ مگر اس کے ساتھ ایک بات کا خیال رہے کہ سائنس مغرب سے آتی ہے اور اس کے ساتھ تہذیب جدید کے بُرے اثرات بھی آتے ہیں۔ اس بے دینی کی تہذیب سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے جو راہ حق سے منحرف کراتی ہے۔ اس سے بہت سی خرابیاں اور فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ حق کے ساتھ جینا ہی اصل حیات ہے۔ ورنہ اس کے بغیر زندگی موت ہے۔ اگر ثبات اور دوام چاہیے تو وہ قرآن کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے اسی کی تعلیم پر عمل کرنے سے قوم زندہ ہوسکتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ میں نے مسلمانوں کو ایک نئی سوچ ایک نیا فکر دیا ہے۔ گویا کہ پرانی شاخ کو پھر تازہ اور ہرا کر دیا ہے۔ اے شاہِ افغانستان تو بھی میری ان حکمت آموز اور زندگی بخش باتوں پر عمل کرتا کہ دنیا میں کامیاب اور سُرخرو ہو۔

جب اقبال کا گزر کشمیر میں ہوا تو ساکنانِ خطہ کشمیر کی پست حالت دیکھ کر جی بھر آیا۔عنوان تو ہے۔ ''ساقی نامہ''اور''درنشاط باغ نوشتہ شد''۔اس کے نیچے لکھا ہے۔مگر اصل میں یہ پرخلوص دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔جواس حالت کو دیکھ کر تھم نہ سکی۔

کشیری کہ بابندگی خُو گرفتہ
بُتے می ترا شد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے
خودی ناشناسے ، ز خود شر مسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ اُو
نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ اُو فروغِ نگاہے
نہ در سینۂ او دلِ بیقرارے
از آن مے فشان قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے[۴۹]

ان پرتاثیر الفاظ کا اثر کشمیر کے اہالیان پر بہت زیادہ ہوا اور مجموعی طور پر پوری قوم بیدار ہوگئی۔ان کی ذہنی حالت بدل گئی اوران کا رخ تنزل کی طرف سے ترقی کی طرف اورانحطاط سے رِفعت کی طرف ہوگیا۔

افغانستان اور ہندوستان کے درمیان جو آزاد قبیلے آباد ہیں وہ تو روحانی حالت کی حیثیت سے پہلے ہی آگ ہیں۔افغانستان جاتے ہوئے جب اقبال کا گزر اس علاقے میں سے ہوا تو اس کی روح ان جوان مردوں کی زیارت سے تازہ ہوگئی۔مگران کی منتشر کیفیت اور بے کیف حالت سے مزاج پر اثر ہوا۔ان کو تنظیم اور تعمیر کا راستہ بتایا اور کامیابی اور عروج کی طرف راہنمائی کی۔''خطاب بہ اقوام سرحد''

اے ز خود پوشیدہ خود را بازیاب — در مسلمانی حرام است این حجاب

چیست دین ؟ دریافتن اسرارِ خویش — زندگی مرگ است بے دیدار خویش

زندہ مرد از غیر حق دارد فراغ — از خودی اندر وجودِ او چراغ
پائے اُو محکم بر زمِ خیر و شر — ذِکر اُو شمشیر و فکر او سپر
میر خیل ! از مکر پہنائی بترس — از ضیاعِ روحِ افغانی بترس!
عالَمِ موجود را اندازہ کُن — در جہاں خود را بلند آوازہ کُن
در گذر از رنگ و بوہائے کُہن — پاک شو از آرزو ہائے کُہن
زندگی بر آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس

آب و گِل را آرزو آدم کند   آرزو مارا ز خود محرم کند
تو خودی اندر بدن تعمیر کُن   مُشتِ خاکِ خویش را اکسیر کُن۵۰

اقبال ایک فوق العادۃ دماغ لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اس کی زبان میں تاثیر اور الفاظ میں جادو ہے۔ جس طرف اس کا رخ ہوتا ہے اس طرف آگ لگا دیتا ہے۔ اس کے پیغام سے ایک عالم جاگ اٹھا ہے۔ ہر طرف بیداری کی روح موجزن نظر آتی ہے۔ خواب کا طلسم ٹوٹ گیا ہے اور ہر کوئی قدم آگے بڑھانے پر مستعد نظر آتا ہے۔ اقبال مشرق کا باسی ہے۔ اس کا تعلق مشرق سے اور وہ مشرق کا شاعر ہے۔ اس لیے مشرق کو جگانا اس نے اپنے ذمّے لیا اور وہ اس بات میں کامیاب ہوا۔

پریس میں بھیجنے سے پہلے جب میں نے اس مضمون کو پھر سے پڑھا تو محسوس ہوا یقینی طور پر نامکمل ہے۔ کچھ نکات تو عجلت کے سبب نظر انداز ہو گئے ہیں اور اس چھوٹے سے مقالے میں سب کا تشریح کے ساتھ بیان کرنا ممکن بھی نہ تھا اور کچھ مقامات عمداً مجھے چھوڑنے پڑے چونکہ فضا اس امر کی مجھ کو اجازت نہ دیتی تھی۔ جس طرح سے حضرت استاد کے ابتدائی دور کی منظومات میں شاعرانہ رنگ دوسرے رنگوں کی نسبت غالب ہے۔ بسیط اور مفصل مضمون کے لیے جناب علامہ کی تمام تصانیف کا مطالعہ بنظر غائر ضروری ہے۔ میں یہ خدمت میں عرض کر دوں کہ اقبال کا سمجھنا مذاق نہیں ہے۔ اقبال دوسری یا چھوتھی جماعت کے لیے نظمیں نہیں لکھتا کہ بچے اس کو پڑھیں اور پھر پھاڑ کر پھینک دیں۔ اقبال استادوں کا استاد ہے، اس کے حلقۂ احباب میں یا جسے حلقۂ تلامیذ کہہ لو۔ بڑے بڑے گرانپایہ لوگ موجود ہیں۔ جو اپنے اپنے فن کے استاد ہیں۔ مگر پھر بھی اس منور شمع سے اپنا سینہ روشن کرنے چلے آتے ہیں۔ یہ امر بھی شاید آپ کی معلومات میں اضافہ کرے گا کہ اقبال کو ہمیشہ سے شاگرد کا نام رکھ کر کسی کو اپنے حلقے میں شامل کرنے سے گریز رہا۔ مگر رفیق حبیب یا دوست بنا کر اسے تلقین کرنے میں اور رموز وا کرنے میں شغف رہا ہے۔ یہی اسلامی مساوات اخوت کا سبق تھا اور خاکی دنیا سے بہت بلند عالم کی نشانی۔ اقبال میں سب عناصر موجود ہیں۔ شاعری، فلسفہ، ادب، سیاست اور ان سب کے ساتھ ایک رفیع الشان بلند پروازی۔ آپ کی توجہ اکثر شاعری میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ چونکہ تنہا یہ عنصر ہی اس قدر بیش قیمت اور جاذب توجہ ہوتا ہے کہ آپ دوسرے عناصر پر غور نہیں کرتے اور نظم ختم ہو جاتی ہے۔ گویا آپ کے پیش نظر صرف شعر کی خوبیاں رہتی ہیں۔ اب میرا مشورہ آپ سے یہ ہے کہ آپ کسی نظم کو ایک دفعہ نہیں دس دفعہ ہر روز پڑھیے پھر غور کیجیے۔ تنہائی میں سوچیے کہ شاعر کا مقصود کیا تھا۔ رفتہ رفتہ آپ پر اقبالی معرفت کا دروازہ کُھلتا جائے گا اور آپ اس بلند اور اعلیٰ طبقے میں داخل ہو سکیں گے۔ یا کم از کم اس کی جھلک سے مستفید ہو سکیں گے جہاں اقبال کا نشیمن ہے۔

ایک مشین جس قدر پیچیدہ اور مخصوص ہوتی ہے اسی قدر اس کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز۔ ریڈیو صرف تربیت یافتہ اور اس فن کے ماہر ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح سے اقبال بھی اتنا بڑا عالم ہے۔ کہ اس کو سمجھنے کے لیے اس پیمانے کا عالم ہونا چاہیے۔ یا اس کے قریب قریب۔ اقبال اس قدر بلند فضا میں اڑتا ہے کہ اس بلندی پر پہنچنے کے لیے بال و پر بھی مضبوط ہونے چاہییں یعنی اگر اس فضا میں داخل نہ ہو سکیں تو

کم از کم اس کے نزدیک جا کر اس کی نورانی جھلک سے تو مستفید ہو سکیں وہ عالم بالا کا اقبال ہے۔ جو اس کی صحیح روح ہے۔ لوگ اکثر اسے عالم خاکی کے قالب میں دیکھتے ہیں، یعنی اس کے الفاظ پر غور کرتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ کی روح پر غور نہیں کرتے۔

حواشی

۱۔ ''بانگ درا''۔ص ۷۷ ''شاعر''۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۔ ''اسرار و رموز''۔کلیات اقبال (فارسی) اقبال اکادمی پاکستان ص، ۳۵ درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ
۳۔ ''اسرار و رموز''۔کلیات اقبال (فارسی) اقبال اکادمی پاکستان، ص، ۳۷/۳۸ درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ۔
۴۔ ''بانگ درا'' (ترانۂ ہندی) کلیات اقبال (اردو) ص۹۴۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۵۔ ''بانگ درا'' (نیا شوالہ) کلیات اقبال (اردو)، ص۹۸۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۶۔ ''بانگ درا'' (آفتاب صبح) کلیات اقبال (اردو)، ص۶۴۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۷۔ ''بانگ درا'' (تصویر درد) کلیات اقبال (اردو)، ص۸۲۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۸۔ ''بانگ درا'' (نیا شوالہ) کلیات اقبال (اردو)، ص۹۸۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۹۔ ''زبور عجم'' (بندگی) کلیات اقبال (فارسی)، ص۱۱۶۔۱۱۷۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۰۔ ''بانگ درا'' کلیات اقبال (اردو)، ص۲۷۹۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۱۔ ''بانگ درا'' (ترانۂ ملی) کلیات اقبال (اردو)، ص۱۷۰۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۲۔ ''بانگ درا'' (وطنیت) کلیات اقبال (اردو)، ص۱۷۱۔۱۷۲۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۳۔ ''اسرار و رموز'' کلیات اقبال (فارسی)، ص، ۸۹۔۸۲، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۴۔ ''بال جبریل'' (ساقی نامہ) کلیات اقبال (اردو) ۱۲۷۔۱۳۳، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۵۔ ''پیام مشرق'' (خرابات فرنگ) کلیات اقبال (فارسی)، ص۱۶۰، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۶۔ ''بانگ درا'' (سلطنت) کلیات اقبال (اردو)، ص۲۷۳، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۷۔ ''بانگ درا'' (سلطنت) کلیات اقبال (اردو)، ص۲۸۹، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۱۸۔ ''بال جبریل'' (دین وسیاست) کلیات اقبال (اردو) ص۱۲۲، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۱۹۔ ''ضرب کلیم'' (لادین سیاست) کلیات اقبال (اردو) ص۱۶۵، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۰۔ ''بانگ درا''۔ کلیات اقبال (اردو) ص۲۸۰، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۱۔ ''بانگ درا'' (طلوع اسلام) کلیات اقبال (اردو) ص۲۸۱، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۲۔ ''اسرار ورموز''۔ کلیات اقبال (فارسی) ص۲۷۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۳۔ ''ضرب کلیم'' (دین وہنر) کلیات اقبال (اردو) ص۱۱۲۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
۲۴۔ ''اسرار ورموز''، کلیات اقبال (فارسی) ص، ۸۷، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۵۔ ''اسرار ورموز''؛ ''کلیات اقبال'' (فارسی) ص، ۹۹، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۶۔ ''اسرار ورموز''؛ ''کلیات اقبال'' (فارسی) ص، ۱۱۵، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۷۔ ''ضرب کلیم''۔ کلیات اقبال (اردو) ص، ۶۵۔۶۶۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۸۔ ''اسرار ورموز''۔ کلیات اقبال (فارسی) ص۱۳۴۔۱۳۵۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۲۹۔ ''پیام مشرق'' (جمعیت الاقوام) کلیات اقبال (فارسی) ص، ۱۴۹، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۰۔ ''صرب کلیم'' (جمعیت اقوام مشرق) کلیات اقبال (اردو) ص، ۱۵۹، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۱۔ ''بانگ درا'' (طلوع اسلام)، کلیات اقبال (اردو) ص، ۲۸۵/۲۸۶، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۲۔ ''بانگ درا''۔ کلیات اقبال (اردو) ص۲۷۲، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۳۔ ''بانگ درا''۔ کلیات اقبال (اردو) ص، ۲۷۱، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۴۔ ''بانگ درا'' (نیا شوالہ) کلیات اقبال (اردو) ص، ۹۸، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۵۔ ''بانگ درا'' (نیا شوالہ) کلیات اقبال (اردو) ص، ۹۹، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۶۔ ''پس چہ باید کرد مع مسافر''؛ ''کلیات اقبال'' (فارسی) ص۳۳، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۷۔ ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق''۔ کلیات اقبال (فارسی) ص، ۳۷، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۸۔ ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق''۔ کلیات اقبال (فارسی) ص: ۹، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۳۹۔ ''پس چہ باید کرد مع مسافر''؛ ''کلیات اقبال'' (فارسی) ص، ۲۸۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۴۰۔ ''پس چہ باید کرد مع مسافر''؛ ''کلیات اقبال'' (فارسی) ص، ۷۱۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۴۱۔ ''بانگ درا'' کلیات اقبال (اردو) ص، ۱۹۸، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۴۲۔ ''ضرب کلیم'' کلیات اقبال (اردو) ص، ۳۸۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۴۳۔ ''ضرب کلیم'' کلیات اقبال (اردو) ص، ۳۸۔۳۹۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔
۴۴۔ ''ضرب کلیم'' کلیات اقبال (اردو) ص، ۴۱۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۴۵۔ ’’ضرب کلیم‘‘ کلیات اقبال (اردو) ص،۶۹۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۴۶۔ ’’ضرب کلیم‘‘ کلیات اقبال (اردو) ص،۹۱۔۹۲۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۴۷۔ ’’پیام مشرق‘‘۔کلیات اقبال (فارسی) ص،۲۴۔۲۷،اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۴۸۔ ’’پس چہ باید کرد‘‘۔کلیات اقبال (فارسی) ص،۷۰۔۷۴،اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۴۹۔ ’’پیام مشرق‘‘۔کلیات اقبال (فارسی) ص،۹۴۔۹۵،اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۵۰۔ ’’پس چہ باید کرد‘‘۔کلیات اقبال (فارسی) ص،۲۹۷۔۳۲۷اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۵۱۔ ’’پس چہ باید کرد مع مسافر‘‘۔کلیات اقبال (فارسی) ص،۳۲۷۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔